بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

الحاد و بے دینی کے اِس دَور میں دین پسند لوگوں کو جس قسم کے نامساعد حالات سے قدم قدم پر سابقہ پیش آتا ہے اُس سے ہر وہ شخص پوری طرح آشنا ہے جس نے زندگی کے کسی مرحلے پر بھی غیر دینی قوتوں سے مصالحت کے بغیر زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔ لادینی قوتوں نے سیاسی تفوق حاصل کرنے کے بعد دنیائے اسلام میں ایک ایسا ماحول تیار کر دیا ہے جس میں نہ صرف بے دین طاقتوں کو غلبہ حاصل ہے بلکہ انہوں نے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس بات کا بھی پورا التزام کیا ہے کہ ہر لمحہ گمراہیوں کے طوفان اٹھتے رہیں، لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی مقدس پنکھڑیاں مرجھا جائیں اور اُن کی جگہ دنیا پرستی اور فسق و فجور کی اکاس بیل ان کے دل و دماغ پر پوری طرح اپنا تسلط قائم کر لے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں جبکہ دینی کام کرنے والوں پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے، دین کو بلند کرنے کی کوئی جدوجہد، خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی میں کی جائے یا کسی طریق سے انجام دی جائے، بڑا ہی صبر آزما اور کٹھن کام ہے اور اس راہ کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو محض ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانوں کا نظارہ کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ سمندر کے اندر اتر کر مخالفتوں کے تھپیڑے برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔

باقی شعبوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اسلامی لٹریچر کی تدوین و اشاعت کے متعلق بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات یہ کام کر رہے ہیں وہ واقعی بڑے

حوصلہ شکن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ اس دور میں جبکہ جدید ادب کی لذتیت نے لوگوں کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے کسی دینی کتاب کا شائع کرنا یا دینی رسالہ کا زندہ رہنا محض تائیدِ ایزدی ہے۔ ورنہ حالات تو ایسے "سبے لذت ادب" کی اشاعت کے بالکل متحمل نظر نہیں آتے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحیمی اور کریمی کا کرشمہ ہے کہ ترجمان القرآن جیسا "خشک" پرچہ گذشتہ اکتیس سال سے مسلسل مذاقِ عام کے خلاف کام کر رہا ہے، نہ صرف یہ کہ اس پوری مدت میں تمام حوادث کے باوجود زندہ رہا۔ اور کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، بلکہ اس کے "منصبِ رسالت نمبر" کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس پر ہم منعمِ حقیقی کی بارگاہ میں جس قدر سجدۂ شکر بجا لائیں کم ہے۔ یہ نمبر بیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے اور ابھی مزید مانگ آ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ انکارِ حدیث کے گمراہ کن اور فتنہ انگیز پراپیگنڈا سے سخت تنگ آئی ہوئی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں کسی معقول اور سنجیدہ طرزِ استدلال کے لیے سخت بیتاب تھی۔ وہ جب اس کے سامنے آیا تو اس نے اسے اپنی ہی گم شدہ متاعِ عزیز سمجھ کر جذب و شوق سے قبول کیا۔ ہمارے نزدیک تعداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد نہ تو حصولِ شہرت ہے اور نہ جلبِ منفعت۔ اس کی غرض شروع سے صرف ایک ہی ہے کہ جس مقدس نظام کو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لیکر دنیا میں تشریف لاتے ہیں اسے ان کی ہدایت کے مطابق دنیا میں نافذ کیا جائے۔ اگر جاہ و مال کا حصول پیشِ نظر ہوتا تو پھر خطرات کو دعوت دینے کے بجائے اقتدار کے سایہ میں عافیت تلاش کی جاتی اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ہمارے نزدیک دیکھنے کی چیز وہ جذبۂ اخلاص ہے جس کے تحت لوگوں نے اس گراں قیمت اشاعتِ خاص کا خیر مقدم کیا ہے اور اس سے اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امت کی عظیم اکثریت سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کس قسم کے پاکیزہ جذبات رکھتی ہے۔ اس پرچہ کی مانگ امت کے ہر طبقہ میں ہوئی ہے۔

پروفیسر، وکلاء، نجار، کارخانہ دار، ملازمین، ڈاکٹر، اطبائے تعلیم یافتہ اور قدیم درسگاہوں کے فارغ التحصیل، غرض سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس نے اس کی اشاعت میں اپنی بساط کے مطابق حصّہ نہ لیا ہو اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہمارے شریک کار رہے ہیں جنہیں ہمارے ساتھ بعض مسائل میں شدید اختلاف رہا ہے۔ یہ سب اُسی کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہماری اپنی محنت اور قابلیت کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

اَللّٰھُمَّ نَسْئَلُکَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَنَسْأَلُکَ عَزِیْمَۃً فِی الرُّشْدِ وَنَسْأَلُکَ شُکْرَ نِعْمَتِکَ وَحُسْنَ عِبَادَتِکَ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّۃِ وَالنَّجَاۃَ مِنَ النَّارِ

گذشتہ ماہ کے واقعات میں امتِ مسلمہ کے لیے جو واقعہ سب سے زیادہ دلفگار اور نتائج کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے وہ ترکی کی فوجی عدالت کا وہ ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ ہے جس کے تحت یاسیدہ کے جزیرے میں چار سو ساٹھ افراد کے خلاف مقدمہ چلا کر ۱۵ کو موت کی سزا، ۳۱ کو عمر قید کی سزا، اور ۴۱۸ کو ایک سال سے ۱۵ سال قید کی سزا دی گئی۔ جن بدنصیب ۱۵ افراد کو پھانسی کا حکم سنایا گیا ان میں سے ۱۲ افراد کی سزائے موت کو تو عمر قید میں تبدیل کیا گیا مگر ترکی کے تین نامور افراد یعنی سابق وزیر اعظم عدنان مندریس، وزیر مال فطین زورلو اور وزیر خارجہ حسین زورلو؟ اوزلستان کو پوری دنیا کے احتجاجوں، عرضداشتوں اور اپیلوں کے باوجود تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ خونیں ڈرامہ اس سرعت کے ساتھ کھیلا گیا کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی اور عام طور پر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ عدالت کی یہ ساری کارروائی اوّل تا آخر محض ایک ڈھکوسلا تھی جس کا مقصد ہی مندریس اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ انصاف کی تاریخ کا یہ دلچسپ ترین مقدمہ تھا کہ اس میں صفائی کے گواہ بھی استغاثہ کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اور صفائی کے لیے وکیل بھی حکومت ہی نے

مقرر کیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب حکومت کے اپنے مقرر کردہ وکیل صفائی نے اپنے مؤکل کے حق میں زوردار دلائل پیش کیے اور استغاثہ نے محسوس کیا کہ اس کا مکروفریب آشکارا ہونے لگا ہے تو وکیل صفائی کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد ان بے کسوں کی صفائی کے لیے جو دوسرا وکیل مامور ہوا وہ چونکہ اپنے سامنے حق گوئی کا حشر دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے کذب و باطل کے آگے سرنگوں ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور استغاثہ کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا۔ مقدمہ کے دوران میں ملزموں کے ساتھ "عدالت" پے درپے تذلیل اور درشتی کا جو رویہ ظاہر کرتی رہی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دراصل یہ عدالت نہیں ہے بلکہ استغاثہ ہی کا ایک شعبہ ہے۔ پھر دوران مقدمہ میں ان ملزموں کو جو اذیتیں دی گئیں اور ان کے ساتھ جو وحشتناک سلوک روا رکھا گیا وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ ان بدنصیب لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو ان تکلیفوں کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے حواس کھو بیٹھے، حتیٰ کہ بعض نے اس اعصابی کش مکش اور خوف و ہراس سے نجات پانے کے لیے خودکشی کر لی۔

یہ عدالتی ڈرامہ اپنی مضحکہ خیزی میں اور اس کا ڈراپ سین اپنی ہولناکی میں اُس ڈرامے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے جو چند سال پہلے قاہرہ میں اخوان المسلمین کے خلاف کھیلا گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب کے دلدادہ اور لادینی کے علمبردار حضرات جس روشن خیالی، جس وسیع النظری (لبرلزم)، جس جمہوریت، اور جن اعلیٰ اصولوں کی پیروی کے مدعی ہیں، ان ساری چیزوں کی حقیقت کیا ہے۔ دراصل یہ لوگ جہاں بھی ہیں اپنی مسلم قوم کی عظیم اکثریت کے اندر ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہیں جسے نظم و نسق، تعلیم، عدالت، فوج اور معیشت میں مضبوط پوزیشن حاصل ہو گئی ہے۔ اب یہ اقلیت محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی مرضی زبردستی اپنی قوم پر مسلط

کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کوشش میں جمہوریت، آئین، قانون، انصاف، اور متفقہ فیصلہ ہر چیز کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ مذہب کا راستہ روکنے کے لیے وہ ہر بازی کھیلنے اور ہر چال چلنے کے لیے تیار ہے، اور اہلِ مذہب پر جن برائیوں کا وہ الزام رکھتی ہے اس سے ہزار گنی زیادہ برائیوں کا وہ خود مظاہرہ کر رہی ہے۔

ترکی میں ملک کی فوج نے جس کا اصل فرض وطن کی حفاظت اور پاسبانی کرنا تھا، آئین کو پامال کر کے اور سیاست میں بے جا مداخلت کر کے خود اپنے ہی بھائی بندوں کے ساتھ جو ظلم کیا ہے وہ تاریخ کی ایک نہایت ہی اندوہناک داستان ہے۔ یہ اسی کی مداخلت کا نتیجہ ہے کہ جن لوگوں کو قوم کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا وہ زبردستی ہٹا کر پھینک دیئے گئے اور عصمت انونو کی پارٹی جو بہت چھوٹی اقلیت کی نمائندہ تھی رائے عام کی تائید حاصل کیے بغیر اوپر اٹھا لائی گئی۔ اس اکھیڑ پچھاڑ میں جن لوگوں کو گرایا گیا انہیں صرف گرانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں پھانسیوں پر بھی لٹکا دیا گیا۔ یہ شدید جذبہ انتقام کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ عدنان مینڈریس اور جلال بایار مذہبی گروہ کے لوگ تھے اور لادینی نظام سے دینی نظام کی طرف ملک کو پلٹائے لیے جا رہے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ بھی مصطفیٰ کمال کے متبعین ہی میں سے تھے اور اسی سیکولرزم کے قائل تھے جس کے عصمت انونو اور یہ فوجی حضرات، ہیں۔ دراصل ان کے خلاف یہ سارا غصہ اتنی سی بات پر تھا کہ مذہب اور اہلِ مذہب کو جنہیں ترکی مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی سے بھی زیادہ اکثریت حاصل ہے، انہوں نے ذرا سی ڈھیل بھی کیوں دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کہیں اکثریت کے منشا کے مطابق مذہب کے حامی برسرِ اقتدار آتے نظر آتے تو یہ "روشن خیال" اور "وسیع المشرب" (لبرل) لوگ، جو آج بھی جمہوریت کے ڈھول پیٹ رہے ہیں، اپنی روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کے کیسے نمونے پیش کرتے۔

ترکی میں یہ جو کچھ ہوا ہے وہ درحقیقت اُس وسیع کشمکش کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جو دین پسند طاقتوں اور لادینی قوتوں کے درمیان گذشتہ ایک صدی سے پوری دنیائے اسلام میں جاری ہے۔ ترکی ہی وہ ملک ہے جس میں یہ کشمکش سب سے پہلے کھل کر نمودار ہوئی اور اس کے نتائج پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا پر آشکارا ہوئے۔ اس لیے اس ملک کے حالات کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے از حد ضروری ہے۔

ترکی ایک ایسا ملک ہے جو مغربی ممالک کے عین درمیان واقع ہے۔ کئی صدیوں تک وہ اہلِ مغرب سے برسرِ پیکار رہا۔ پہلے اس کی جنگ فاتحانہ تھی۔ پھر مسلسل دو صدیاں ایسی گزریں جن میں وہ اہلِ مغرب سے شکست پر شکست کھاتا چلا گیا، حتیٰ کہ جنگِ عظیم اوّل میں اس کی شکست انتہا کو پہنچ گئی۔ ابتداءً یہ شکستیں صرف مادّی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ مکمل دماغی و روحانی شکست میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ جب وہ کسی مدّمقابل سے پٹتا ہے تو بڑا سخت جذبۂ انتقام اس میں ابھرتا ہے۔ لیکن جب وہ پے در پے مار کھاتا ہی چلا جاتا ہے تو آخر کار سخت مرعوبیت کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے پر ترک اسی ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اپنی پستی و ذلّت اور مغرب کی برتری کو انتہائی عروج پر دیکھ کر اس کے جسم ہی نے نہیں، اس کے دل و دماغ اور اس کی روح نے بھی مغرب سے ہار مان لی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو مغربی تہذیب و تمدّن کے رنگ میں رنگ دینے، بلکہ پوری طرح جذب کر دینے کے سوا اور کسی چیز میں خیر نہیں ہے۔

اس عمل کا آغاز ۱۹۲۴ء میں "خلافت" کے خاتمے سے کیا گیا، اور اس کے بعد جلد ہی ترکی دستور کی وہ دفعہ منسوخ کر دی گئی جس کی رو سے سلطنت کا مذہب "اسلام" تھا۔ یہ تغیّر ابتدا میں تو اس دعوے کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ہم سیاست کو مذہب سے الگ کرنا چاہتے ہیں، مگر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ مذہب کو سیاست کے تابع کرنے اور پھر اس کی جڑ کاٹنے کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسلامی شریعت، جسے ملک میں قانون کی حیثیت حاصل تھی، منسوخ کردی گئی اور اس کی جگہ سوئٹزرلینڈ کا دیوانی، اور اٹلی کا فوجداری، اور جرمنی کا تجارتی قانون لاکر نافذ کر دیا گیا۔ پھر شریعت کو مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے بھی باقی نہ رہنے دیا گیا، حالانکہ کفار تک نے مسلم ممالک پر قابض ہونے کے بعد اسے اس حیثیت میں برقرار رکھا تھا۔ وراثت میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر قرار دیا گیا۔ تعدد ازواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا۔ اور طلاق کا اختیار مرد سے کلی طور پر سلب کر کے عدالت کے حوالے کر دیا گیا۔ قرآن کے صریح احکام سے یہ انحرافات اس بات کی کھلی علامت تھے کہ اب اسلامی قانون ترک مسلمانوں کی خانگی زندگی تک کا قانون بھی نہیں رہا ہے۔

دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ پورے ملک میں مذہبی تعلیم کے مدارس بند کر دیئے گئے، سرکاری مدرسوں کے نصاب سے مذہب کی تعلیم خارج کر دی گئی، ابتدائی تعلیم کا پورا نصاب فرانس سے لاکر جوں کا توں نافذ کر دیا گیا، عربی رسم الخط کو قانوناً منسوخ کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، ترکی زبان سے عربی و فارسی الفاظ خارج کرنے کی مہم چلائی گئی، عربی اذان کے بجائے ترکی اذان حکماً رائج کی گئی، اور قرآن مجید کی اصل عبارت کو بھی عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف میں شائع کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں سے ہر تدبیر کا ہدف یہ تھا کہ ترکی قوم کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے کاٹ کر اہل مغرب اور مغربی تہذیب سے جوڑ دیا جائے۔

تیسرا قدم لباس کی تبدیلی تھا۔ ۱۹۲۵ء میں مغربی لباس اور ہیٹ پہننا ترکی باشندوں کے لیے قانوناً لازم کر دیا گیا اور ایک خاص تاریخ مقرر کر دی گئی جس کے بعد کوئی شخص پبلک میں ہیٹ اور مغربی لباس کے سوا کوئی دوسری چیز پہن کر نہ آسکتا تھا۔ اس تبدیلی کا مقصود یہ تھا کہ سارے ترک یورپین بن جائیں اور اہل یورپ بھی انہیں یورپین سمجھیں۔ لیکن امریکہ اور یورپ میں آج بھی ترکوں سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کا قومی لباس کیا ہے۔ کیونکہ ہیٹ اور سوٹ کو وہ جانتے ہیں کہ یہ ترکوں کا قومی لباس نہیں بلکہ مانگے کا لباس ہے۔ اور خود ترک

بھی اب تک اسے اپنا قومی لباس نہیں سمجھتے۔ انتخابات کے زمانے میں لادینی اور فرنگیت کے بڑے بڑے علمبردار تک اندرونی ترکی میں جب ووٹ لینے جاتے ہیں تو ہیٹ پہن کر نہیں جاتے!

چوتھا قدم ترکی ناموں کا تغیر تھا۔ ۱۹۳۴ء میں ازروئے قانون لازم کیا گیا کہ ہر ترک اہل مغرب کی طرح اپنا ایک SURNAME اختیار کرے۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی لیکن دراصل اس طریقے سے جو تحریک چلائی گئی وہ یہ تھی کہ ترکوں کے نام مسلمانوں کے سے نہ رہیں، چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ مثلاً ایک خاتون فاطمہ خانم سے بایان ویمبر بن گئیں، اور ایک صاحب کا نام نورالدین سے نوری ایڈن بنا اور پھر وہ صرف ڈاکٹر ایڈن بن کر رہ گئے۔ آج ترکی کے بکثرت نام اخبارات میں ایسے آتے ہیں جنہیں دیکھ کر بیرونی ممالک کے مسلمان یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ یہ مسلمانوں کے نام ہیں۔

اس پر مزید پردے کا خاتمہ، عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط، اور مغربی ثقافت کے جملہ لوازم کا رواج تھا جسے درحقیقت اسلام اور اس کی تہذیب سے انقطاع پر آخری مہر توثیق سمجھنا چاہیے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں ایک بہت بڑا "اصلاحی" قدم یہ اٹھایا گیا کہ جمعہ کی تعطیل کا دن موقوف کر کے اتوار کو عام تعطیل کا دن مقرر کر دیا گیا۔ شاید قومی ترقی کے راستے میں آخری کاوٹ یہی باقی رہ گئی تھی۔

یہ تغیرات (جنہیں اہل مغرب اپنی اصطلاح میں "اصلاحات" کہتے ہیں اور ان پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں) کچھ یونہی نہیں ہو گئے بلکہ انہیں انتہائی زبردستی اور سخت ظلم و ستم کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ ترکی کے عام مسلمان اپنی دینداری اور اسلام پسندی میں دنیا کی کسی مسلمان قوم سے کم نہیں ہیں۔ وہ ان میں سے کسی تغیر پر راضی نہیں تھے اور نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف ایک چھوٹی سی فرنگیت زدہ اقلیت یہ تغیرات چاہتی تھی، اور چونکہ اسے فوج ملکی نظم و نسق اور سیاسی نظام پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا اس لیے وہ ایک ایک تغیر کو زبردستی

اپنی قوم پر ٹھونستی چلی گئی۔ ترکی کے مشرقی صوبوں میں اس پر پے در پے بغاوتیں ہوئیں۔ ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۷ء کی بغاوتیں تو اچھی خاصی شدید تھیں۔ مگر ان کو پوری طاقت سے کچلا گیا اور ۱۹۳۷ء کی بغاوت کے بعد پورے ۹ سال تک مشرقی اضلاع میں مارشل لا نافذ رہا۔ دوسرے علاقوں میں اگرچہ کوئی مسلح بغاوت نہیں ہوئی لیکن اس غلط پالیسی کی بدولت قوم اور حکومت کے درمیان ایک خاموش کشمکش برپا ہو گئی۔ قوم کا دلی تعاون حکومت کو حاصل نہ رہا۔ تعاون کی جگہ عام لوگوں کی نفرت و بیزاری نے ایک پُرامن مزاحمت کی کیفیت پیدا کر دی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی قوم کسی میدان میں بھی وہ ترقی نہ کر سکی جو قوم اور حکومت کے دلی تعاون کی صورت میں کر سکتی تھی۔ ترکوں کے ملک میں ذرائع و وسائل کی کمی نہیں ہے۔ ترکوں میں صلاحیتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ۲۷ سال کی مدت اس کے لیے بہت کافی تھی کہ وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ آخر اتنی ہی مدت میں جاپان اپنے قلیل تر وسائل سے مغربی قوموں کا ہمسر بن چکا تھا۔ مگر ترکی کے برسرِ اقتدار طبقے نے یہ قیمتی زمانہ اپنی ہی قوم کے عقائد اور ایمان و ضمیر سے لڑنے اور اس کی تہذیب و روایات کو کچلنے میں صرف کر دینا زیادہ پسند کیا، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ وہ ہر چیز میں امریکہ کے دریوزہ گر بن کر رہیں اور روس کا کابوس ہر وقت ان کے سر پر سوار رہے۔

اس مدت میں ترکوں نے یہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ ان کے حکمرانوں کی اس پالیسی نے انہیں کہاں پہنچا کر چھوڑا ہے۔ رسم الخط بدل کر وہ اپنے ماضی سے بالکل کٹ گئے اور صدہا برس کی علمی میراث جو انہیں اپنے اسلاف سے ملی تھی یک لخت ان کے لیے حرفِ بے معنی بن کر رہ گئی۔ مذہب کو زندگی سے خارج کر کے ان کی نئی نسلوں کے لیے اخلاق کی کوئی بنیاد باقی نہ رہی۔ اسلام کے رشتے کو تیاگ کر وہ دنیا بھر کی تمام مسلمان قوموں سے قطعاً بے تعلق ہو گئے

اور مشرق سے مغرب تک، کوئی ان کا ہمدرد نہ رہا۔ جن مغربی قوموں سے جڑنے کے لیے انہوں نے یہ سارے پاپڑ بیلے۔ وہ اس بات پر تو بہت دل کھول کر انہیں داد دیتی رہیں کہ وہ اسلام کی جگہ مغربی تہذیب اختیار کر کے بڑی روشن خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں، مگر انہوں نے ایک دن کے لیے بھی انہیں اپنا نہ سمجھا اور نہ اپنے برابر کی حیثیت دی۔ اس صورتِ حال کی تلخی کو بے دین اقلیت تو محسوس نہیں کرتی تھی، مگر ان کی بہت بڑی اکثریت شدت کے ساتھ اسے محسوس کر رہی تھی اور اس کا مداوا کرنے کے لیے بیتاب تھی۔

۲۲-۲۳ سال تک حکومت کے بدلنے کی کوئی پُرامن آئینی صورت ترکی میں نہ تھی؛ کیونکہ ملک میں صرف ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور از روئے قانون کوئی دوسری پارٹی وجود میں نہ آسکتی تھی۔ مگر ۱۹۴۶ء میں رائے عام کے دباؤ سے یہ قانون بدلنا پڑا اور کمالی انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ دوسری جماعتیں وجود میں آنے کا امکان پیدا ہوا۔ اس طرح گرفت ڈھیلی پڑنے سے ترکی قوم کو یہ موقع مل گیا کہ "لادینی" کے پیرووں ہی میں سے کم از کم ایسے آدمیوں کو انتخابات میں ابھار کر لاتے جو مذہب کے حامی نہ سہی، اس کی بیخ کنی کرنے والے تو نہ ہوں۔

قوم کے ان رجحانات سے ملک میں کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ قوم انتہائی دل برداشتگی کے ساتھ اُس پالیسی کی مار سہہ رہی ہے جو مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو زبردستی اُس پر ٹھونستے رہے ہیں۔ اس لیے مقابلہ میں دوسری پارٹی بننے کے مواقع پیدا ہوتے ہی کمالی پارٹی کے اپنے ممبروں میں سے بکثرت لوگوں نے یہ بھانپ لیا کہ قوم کے مذہبی جذبات سے اپیل کر کے وہ انتخابات میں حکمران گروہ کو چت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ٹھیک یہی نتیجہ رونما ہوا اور عصمت انونو بھاری اکثریت سے شکست کھا کر جلال بایار اور عدنان مینڈریس کی پارٹی کے لیے جگہ خالی کرنے پر

مجبور ہو گئے۔ مینڈریس مرحوم کو خواہ کوئی شخص مخلص مانے یا منافق قرار دے، بہر حال اس امر واقعہ سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی کامیابی کی واحد وجہ یہ تھی کہ ترکی قوم مذہب کے معاملہ میں ان سے اعتدال اور ڈھیل کی توقع رکھتی تھی۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کمال اتاتورک اور عصمت اینونو ۲۷ سال تک جس پالیسی پر ترکی کو زبردستی ڈھلیل رہے تھے، قوم اس پر راضی نہ تھی اور بے چینی کے ساتھ اسے بدلنے کے لیے موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ اُن لوگوں کے اخلاق و کردار پر ترکی قوم کی طرف سے ایک بدترین تبصرہ تھا جو جمہوریت کے جھوٹے نعرے بلند کر کے اپنی قوم کی گردن پر سوار ہوتے اور اس کی مرضی کے خلاف ربع صدی سے زیادہ مدت تک حکمرانی کرتے رہے۔

نئی قیادت جو رائے عام کی تائید کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی یہ خود اسلامی شریعت کی کس حد تک پابند تھی، اس کے متعلق اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس قیادت نے عوامی خواہشات کا پورا پورا احترام کیا اور اس اعتبار سے اس کا یہ طرزِ عمل جمہوریت کے عین مطابق تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی حکمراں پارٹی اپنی قوم کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنے لگے اور اُسے بتوں کے زور سے ایسے راستوں پر ہانکنے کا عزم کرے جنہیں وہ قوم اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتی ہو۔ خصوصاً جمہوریت کا نام لے کر یہ استبداد اور بدترین درجے کی بددیانتی ہے۔ عدنان مینڈریس اور اُس کے رفقاء کار نے ایمانداری کے ساتھ قوم کی اکثریت کے جذبات کا لحاظ کیا اور اسے اسلام کی طرف پلٹنے کے مواقع فراہم کیے۔ چنانچہ اُن کی ان کوششوں کی بدولت

— مسجدوں کے دروازوں سے قفل کھل گئے۔ کثرت سے نئی مسجدوں کی تعمیر بھی ہوئی اور پرانی خستہ حال مسجدوں کی تجدید بھی کی گئی۔

— مسلمان قوموں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا۔ عربوں سے تعلقات (باقی صفحہ ۸۵ پر)

(بقیہ اِشارات)

درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسجدِ اقصیٰ کی مرمت میں بھی دل کھول کر حصّہ لیا گیا۔

——— عربی اذان پر سے پابندی اٹھالی گئی جس کا ترکی قوم نے انتہائی جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔

——— درسگاہوں میں مذہبی تعلیم دوبارہ جاری کر دی گئی۔ خاص طور پر امام اور خطیب تیار کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

——— مغربی ممالک کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے کے بجائے ترکی حکومت نے اسلامی ممالک سے مودت کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ ایران و پاکستان کے ساتھ اتحاد اسی نئی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کی کھلم کھلا حمایت بھی اسی کی رہین منت تھی۔

——— اسلامی تحریکات کے ممنوع الاشاعت لٹریچر پر سے پابندی اٹھا دی گئی۔[1]

ان حقیقی اصلاحات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قوم اور حکومت میں وہ دلی تعاون شروع ہو گیا اور بڑھتا چلا گیا جس کے دروازے اتاترک اور عصمت انیونو کے دور میں بند ہوتے چلے جا رہے تھے۔ قوم کے جذبات سے لڑنے والوں کے مقابلہ میں ان کا احترام کرنے والوں کو زیادہ تعاون حاصل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ میندریس کے دس سالہ دورِ حکومت میں ترکی

---

[1] اس لٹریچر میں بدیع الزمان نورسی کا لٹریچر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ترکی کا یہ جلیل القدر فرزند جنگِ آزادی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھا۔ مصطفیٰ کمال کی ری پبلکن پارٹی جب تک اسلام کی حامی رہی اُس وقت تک علامہ نورسیؒ اس کے ہمنوا رہے۔ مگر جب لوزان کانفرنس میں ترکی کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو وہ الگ ہو گئے اور اُن کا لٹریچر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ عدنان میندریس کے عہد وزارت میں "رسائلِ نور" کے نام سے ان کا لٹریچر دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔

کے اندر کہیں بغاوت نہیں ہوئی۔ عام باشندوں نے مینڈریس کے تعمیری کاموں میں خوب حصہ لیا اور اس بنا پر انہوں نے دس سال میں ملک کی بہتری کے لیے وہ کام کیا جو ان سے پہلے ۲۷ سال میں نہ ہو سکا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ وہ ترکی کے عوام میں کس قدر مقبول تھے، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جب لندن اور مغربی جرمنی کے رستے میں طیارے کے حادثے سے بال بال بچ نکلے تو پورے ترکی میں جشن منایا گیا اور شکرانے ادا کیے گئے۔ جب وہ واپس ملک میں پہنچے تو ان کا بڑا پرجوش استقبال ہوا اور لوگوں نے ہزاروں دنبے قربان کیے۔

بے دین طبقہ اس پوری مدت میں انگاروں پر لوٹتا رہا اور جوں جوں ترکی میں اسلام زندہ ہوتا گیا اس کا غصہ بڑھتا چلا گیا۔ انگلستان، امریکہ، اور دوسرے ممالک میں اسلام کے جتنے دشمن تھے، وہ سب بھی اس حالت کو بڑی تشویش سے دیکھتے رہے اور آخر میں تو انہوں نے پے در پے خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ خصوصاً یہودی پریس اور خبر رساں ایجنسیاں تو اس پر سخت چراغ پا تھیں۔ اندر اور باہر کے یہ سب لوگ اس بات سے پوری طرح مایوس تھے کہ خالص آئینی و جمہوری تدابیر سے آزادانہ انتخابات میں کبھی اُن لوگوں کو شکست دی جا سکے گی جو ترکی میں اسلام کے احیاء کے خواہش مند ہوں، یا کم از کم اُس کے لیے مواقع فراہم کریں۔ اس لیے اندر والوں نے مینڈریس کی حکومت کے خلاف سازشیں اور فتنہ پردازیاں شروع کر دیں۔ اور باہر کے دشمنِ اسلام پریس اور خبر رساں ایجنسیوں نے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ یہودی یوں تو پوری دنیائے اسلام کے سخت دشمن ہیں لیکن وہ خاص طور پر ترکی میں احیائے اسلام کی کسی تحریک کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ یہ ملک الحاد و بے دینی کا شکار رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کی سب سے بڑی تنظیم، یعنی بین الاقوامی یہودی فیڈریشن کا صدر مقام ترکی میں ہے اور صیہونی نظریے کا سب سے بڑا

علمبردار سامی کو بیراج وہیں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد یہودی انجمنیں وہاں کام کرتی ہیں اور اسرائیل کو وہاں سے ہر قسم کی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ یہودیوں کے لیے ٹرکی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اُس کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں اسرائیل کے سفارت خانے میں ۲۴ بلند پایہ یہودی علماء اور انشا پرداز صرف پراپیگنڈے کے کام پر متعین ہیں۔ عدنان مندریس سے یہودی اور مغربی پریس کو کس حد تک دشمنی تھی اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی دیکھ لینا کافی ہے کہ عصمت انونو کی پارٹی نے اپنے دورِ حکومت میں برسہا برس تک سوائے چند سرکاری اخبارات کے کسی شخص یا ادارہ کو اخبار نکالنے کی اجازت نہ دی تھی، مگر مغربی اور یہودی پریس نے اُس کی اس آمرانہ حرکت کے خلاف ایک لفظ تک بھی نہ کہا۔ مگر جب مندریس نے اس پریس کی فتنہ سامانیوں کے پیشِ نظر "وطن" اخبار کو چند ماہ کے لیے بند کر دیا تو پورے امریکی پریس اور بین الاقوامی پریس ایسوسی ایشن نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور اس ایک واقعہ کو آڑ بنا کر مندریس کو دنیا بھر میں رُسوا اور بدنام کر دیا۔

مندریس سے گلو خلاصی پانے کے لیے بالآخر غیر آئینی انقلاب کا نسخہ آزمایا گیا، یعنی ملک کی ناقابلِ التفات اقلیت نے صرف اس بنیاد پر کہ اسے فوج اور نظم و نسق میں غلبہ حاصل ہے، اُس حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جو عوام کی اکثریت کے ووٹوں سے آئین و قانون کے مطابق برسرِ اقتدار تھی۔ پھر محض تختہ اُلٹنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اکثریت کے ان نمائندوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزائیں بھی دے ڈالی گئیں، تاکہ ترکی عوام اس بات سے بالکل مایوس ہو جائیں کہ وہ کبھی آئینی و جمہوری طریقوں سے انتخابات کے ذریعہ اپنی مرضی کے آدمی اوپر لا سکیں گے۔ اپنی اس کارروائی سے یہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے گویا ہمیشہ کے لیے ترکی میں لادینی کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔ مگر یہ محض فریبِ نظر ہے۔ اس طریقِ کار سے وقتی طور پر تو مخالفانہ تحریکات کو دبایا جاسکتا ہے لیکن اس کے اثرات نہ ایسے کھیل کھیلنے والوں کے حق میں

مفید ثابت ہوتے ہیں اور نہ ان کی قوم کے حق میں قوت و طاقت کے زور سے زبانوں پر تو پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں، لوگوں کے ہاتھوں سے قلم تو چھینے جا سکتے ہیں لیکن دل و دماغ کی دنیا تعزیر و زنجیر کی حدود سے یکسر باہر ہوتی ہے۔ وہاں انسان کا ضمیر جبر و اکراہ کے بغیر فیصلے کرتا ہے اور پھر احساسات و جذبات اُن کے فیصلوں میں قوت پیدا کر کے انہیں مختلف تحریکات کی شکل دیتے ہیں۔ یہی حال آج ترکی میں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں بار بار یہ سوال ابھر کر آتا ہے کہ مینڈریس کا بڑے سے بڑا جرم اگر کوئی تھا بھی تو وہ صرف پکڑ دھکڑ، کتابوں کی ضبطی اور بعض اخبارات کی بندش تک محدود تھا۔ لیکن اُن لوگوں کو مجرموں کے کس کٹہرے میں کھڑا کیا جائے جنہوں نے ستائیس برس تک پوری قوم کو استبداد کے شکنجے میں کسے رکھا، پھر آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر اکثریت کی نمائندہ حکومت کا تختہ اُلٹا، پھر اس کے لیڈروں کو ختم کرنے کے لیے عدالت کا ڈرامہ کھیلا اور انتقام کے جوش میں انہیں موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی گریز نہ کیا۔ لوگ سوچ رہے ہیں کہ آج مغربی اور یہودی پریس کو کیوں سانپ سونگھ گیا ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج کا ایک لفظ بھی کہنے کے لیے تیار نہیں؟ اسی قسم کی ظالمانہ حرکت اگر مینڈریس اور اُس کے رفقاء کار سے سرزد ہو جاتی تو یہی پریس اس پر جیسا کچھ طوفان اٹھاتا اسے دنیا دیکھتی۔ محض اسلام پسند طبقوں ہی کے خلاف دنیائے مغرب میں یہ بغض و عناد کیوں ہے؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات آج ترک عوام ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے دل و دماغ میں اضطراب پیدا کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ سوالات ہیں جو نفرت کے احساسات میں ڈھل کر ترکی قوم کے اندر ایسی سر پھٹول شروع کر سکتے ہیں جس سے اس ملک کو شدید نقصان پہنچنے کا ہر وقت احتمال موجود ہے۔

"تاریخ کی اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی لوگوں کو تنگ نظر اور متعصب کہنے والے وہ لوگ ہیں جن کا اپنا دامن ہر قسم کے ظلم و ستم سے داغدار ہے۔" یا سیدا کے مقدمہ میں

مینڈریس اور ان کے ساتھیوں کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا گیا کہ انہوں نے دستور کی خلاف ورزی کی تھی۔ مگر عجیب لطیفہ ہے کہ اس جرم پر انہیں پکڑنے اور سزا دینے کے لیے وہ لوگ اٹھے جنہوں نے پورے دستور ہی کو اٹھا کر پھینک دیا تھا درآنحالیکہ وہ دستور ہی کی حفاظت و پاسبانی کی قسم کھا کر ترکی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ اگر مینڈریس ملکی دستور کی چند دفعات توڑنے کے لیے سزا کا مستحق تھا تو آخر وہ لوگ کس چیز کے مستحق ہیں جنہوں نے پورا کا پورا دستور منسوخ کر دیا اور اپنے اس عمل سے آئین کی حرمت ختم کر کے رکھ دی؟ کیا اس طرح سے ترکی کے اندر کبھی بھی آئین و دستور کا احترام پیدا ہو سکتا ہے؟ ملک کے مستقبل کا فیصلہ جب ایک دفعہ قاضیٔ شمشیر کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو پھر اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ عدل و انصاف اور کسی ضابطہ کے تحت یہ کام سر انجام دے گا۔ وہ پھر جس طرح چاہے گا معاملات طے کرتا رہے گا اور کوئی قوت بجز سینہ زوری کے اس کے راستہ میں حائل نہ ہو سکے گی۔

جمہوری و دستوری روایات چند دنوں، یا چند مہینوں یا چند سالوں میں نہیں بنتیں۔ یہ دھیرے دھیرے کسی قوم کے دل و دماغ میں مستحکم ہوتی ہیں۔ ان کے استحکام سے ہی کسی قوم اور ملک کا استحکام وابستہ ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ اپنی قوم اور وطن کے حقیقی خیر خواہ ہوتے ہیں وہ کبھی آئینی روایات کو مٹانے کے درپے نہیں ہوتے بلکہ ان کو ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر کسی من چلے نے احترام قانون کی روایات کو ایک دفعہ پامال کرنے کی جرأت کی تو پھر ان کا بحال ہونا قریب قریب محال ہے۔ ترکی میں لادینی کے علمبردار عنصر نے بلاشبہ مسندِ اقتدار حاصل کر لی ہے لیکن اس کوشش میں اُس نے اپنی نادانی سے آئین و قانون کے خلاف جسارت کے بیج بھی بو دیئے ہیں۔ ترکی کے لیے یہ کوئی نیک فال نہیں۔ آج اگر تطہیر کے نام پر مینڈریس اور اُس کے ساتھیوں کو پھانسیوں پر لٹکایا جا سکتا ہے تو کل کسی زیادہ قوت و طاقت رکھنے والے گروہ کے ہاتھوں دوسروں کا

بھی بھی خطر ہو سکتا ہے۔ یہ اگر ایک طرف مندریس کی پارٹی کا مقطع ہے تو یہی ایک دوسرے پُرفتن دور کا مطلع بھی ہو سکتا ہے۔

مندریس اور اس کے خطرناک انجام کو دیکھ کر ترکی کے اندر کوئی شخص جو اپنے ہوش و حواس قائم رکھتا ہو ملک کی زمامِ کار اطمینان کے ساتھ نہیں سنبھال سکتا۔ اُسے ہر لمحہ اس بات کا خدشہ لاحق رہیگا کہ کوئی آئینی قانون اس کی پوزیشن بچانے والا نہیں ہے، کسی وقت بھی اُسے قوت کے ساتھ اقتدار سے محروم کر کے نہ صرف ذلیل و خوار کیا جا سکتا ہے بلکہ موت کے گھاٹ بھی اُتارا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے روح فرسا ماحول میں جہاں آدمی کے سر پر ہر وقت تلوار لٹک رہی ہو، کوئی شخص محض اپنی قابلیت کی بنا پر عوام کو اعتماد میں لے کر آگے نہیں آ سکتا۔ ایسے حالات میں تو اقتدار کی باگیں بالکل قدرتی طور پر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں جو سازشوں اور زیرِ زمین سرگرمیوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس طرح خاموش اور عاقبت اندیش مدبر گمنامی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور بساطِ سیاست پر وہ کھلاڑی چھا جاتے ہیں جو ملک اور قوم کے خادم بن کر رائے عامہ کی تائید حاصل کر کے مسندِ اقتدار حاصل نہیں کرتے بلکہ محض چالبازیوں اور عیاریوں اور قوت کی مدد سے قوم پر اپنی خدائی قائم کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔

خدا کرے ترکی اس انقلاب کے بُرے نتائج سے محفوظ رہے۔

یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ترکی کے تازہ انتخابات کے نتائج سامنے آ گئے۔ ان نتائج نے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر ترکی قوم کو حکومت چلانے کے لیے اپنی مرضی کے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ کس طرح کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں دینا پسند کرتی ہے اور کن لوگوں کو ناپسند کرتی ہے۔ باوجود اس کے کہ انتخابات اسی فوجی اقتدار کے زیر اثر ہوئے ہیں جس نے عدنان مندریس کی پارٹی کا تختہ اُلٹا تھا اور جس نے مندریس اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دیکر عین انتخابات کے آغاز ہی میں قوم کو خوف زدہ اور ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور قانون کی رو سے بھی انتخابات میں مذہب کا نام لیکر اپیل کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا، پھر بھی عصمت انونو کی پارٹی ترکی قوم کی تائید حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سول اور فوج کے ملازمین کی اکثریت جو لادینی کی علمبردار ہے قوم کے اس فیصلے کے آگے سر جھکاتی ہے یا پھر وہی انقلابی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے جن سے اُس نے اکثریت کے منتخب نمائندوں کو ہٹا کر اپنی مرضی چلانے کی پہلے کوشش کی تھی۔